July 2021

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مدارس میں جمود و تعطل کی گنجائش نہیں

”جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود و تعطل کی گنجائش کہاں ہے؟ اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بہکے ہوئے قدموں کو راستہ پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے، یا کسی منزل پر قیام کرلے، یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے، سرود ازلی اور پیغام محمدی اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مرادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کا ہم معنی ہے اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا ہے۔“

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

Rs. 15/-

مركز الإمام أبي الحسن الندوي

دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

اصلاحی خطبات

قربانی کی اصل روح

جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

”آج ہمارے معاشرہ میں جو گمراہی پھیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں حکمت تلاش کرو کہ اس کی حکمت اور مصلحت کیا ہے اور اس کا عقلی فائدہ کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی فائدہ نظر آئے گا تو کریں گے اور اگر فائدہ نظر نہیں آئے گا تو نہیں کریں گے۔ یہ کوئی دین ہے؟ کیا اس کا نام اتباع ہے؟ اتباع تو وہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کر کے دکھایا اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کر کے دکھایا اور اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ عمل اتنا پسند آیا کہ قیامت تک کے لیے اس کو جاری کر دیا، چنانچہ فرمایا کہ ﴿وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ﴾ (الصافات: ۱۰۸)

یعنی ہم نے آنے والے مسلمانوں کو اس عمل کی نقل اتارنے کا پابند کر دیا۔ یہ جو ہم قربانی کرنے جا رہے ہیں، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس عظیم الشان قربانی کی نقل اتارنی ہے اور نقل اتارنے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ جیسے اللہ کے حکم کے آگے انہوں نے سر تسلیم خم کیا، انہوں نے کوئی عقلی دلیل نہیں مانگی اور کوئی حکمت اور مصلحت طلب نہیں کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، اب ہمیں بھی اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے اور قربانی کی عبادت سے یہی سبق دینا منظور ہے۔

جس مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے یہ قربانی واجب فرمائی تھی، آج اسی کے بالکل برخلاف کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! قربانی کیا ہے؟ یہ قربانی (معاذ اللہ) خواہ مخواہ رکھ دی گئی ہے، لاکھوں روپیہ خون کی شکل میں نالیوں میں بہہ جاتا ہے اور معاشی اعتبار سے نقصان دہ ہے، کتنے جانور کم ہو جاتے ہیں اور فلاں فلاں معاشی نقصان ہوتے ہیں وغیرہ، لہٰذا قربانی کرنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جو غریب ہیں، جو بھوک سے بلبلا رہے ہیں تو قربانی کر کے گوشت تقسیم کرنے کے بجائے اگر وہ روپیہ اس غریب کو دے دیا جائے تو اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہر عبادت کا ایک موقع اور ایک محل ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص یہ سوچے کہ میں نماز نہ پڑھوں اور اس کے بجائے غریب کی مدد کر دوں، تو اس سے نماز کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا۔ قربانی کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہے اور معاشی بدحالی کا سبب ہے، معاشی اعتبار سے اس کا کوئی جواز نہیں ہے، یہ درحقیقت قربانی کے سارے فلسفے اور اس کی روح کی نفی ہے، قربانی تو مشروع ہی اس لیے کی گئی ہے کہ یہ کام تمہاری عقل اور سمجھ میں آ رہا ہو یا نہ آ رہا ہو، پھر بھی یہ کام کرو، اس لیے کہ ہم نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے، ہم جو کہیں اس پر عمل کر کے دکھاؤ، یہ قربانی کی اصل روح ہے، جب تک انسان کے اندر اتباع پیدا نہیں ہو جاتی، اس وقت تک انسان انسان نہیں بن سکتا۔“

(۲/۱۳۵-۱۳۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۳ — جولائی ۲۰۲۱ء - ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ — شمارہ: ۷

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

قربانی کا صحیح وقت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا ذَبَحَ لِنَفْسِهِ، وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهُ، وَأَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ."

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کر لی تو بلاشبہ اس نے اپنی ذات کے لیے جانور ذبح کیا اور جس نے نماز عید کے بعد قربانی کی تو یقیناً اس کی قربانی مکمل ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی سنت کو پالیا۔)

(صحیح البخاری: ٥٥٤٦)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

آن لائن تعلیم اور مدارس اسلامیہ! (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ.....۴

.....مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

نقطۂ نظر کا فرق.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

سچائی کیا ہے؟ (مسلسل).....۸

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

صبر واستقامت کا پیکر مثالی.....۱۰

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

عشرۂ ذی الحجہ اور قربانی کے احکام ۱۱

.....مفتی راشد حسین ندوی

حج تربیت کا بہترین مظہر.....۱۴

.....محمد امین حسنی ندوی

تزکیہ واحسان.....۱۵

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

اقوام متحدہ- قیام کا پس منظر.....۱۷

.....محمد مکی حسنی ندوی

مسلم حکمرانوں کے مظالم.....۱۸

.....محمد نفیس خاں ندوی

شمع حقیقت

نتیجۂ فکر:- جناب اصغر گونڈویؒ

جو نقش ہے ہستی کا دھوکہ نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

نیرنگ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے
آنکھوں سے اگر دیکھو پردہ نظر آتا ہے

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

اے پردہ نشیں ضد ہے کیا چشم تمنا کو
تو دفتر گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے

نظارہ بھی اب گم ہے بے خود ہے تماشائی
اب کون کہے اس کو جلوہ نظر آتا ہے

جو کچھ تھی یہاں رونق سب باد چمن سے تھی
اب کنج قفس مجھ کو سونا نظر آتا ہے

احساس میں پیدا ہے پھر رنگ گلستانی
پھر داغ کوئی دل میں تازہ نظر آتا ہے

تھی فرد عمل اصغرؔ کیا دست مشیت میں
اک ایک ورق اس کا سادہ نظر آتا ہے

مدیر کے قلم سے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

آن لائن تعلیم اور مدارس اسلامیہ

آن لائن تعلیم مسئلہ کا حل نہیں ہے، یہ ایک مجبوری ہے، گذشتہ سوا سال سے کووِڈ۱۹ نے جس طرح پوری دنیا کو اپنے شکنجہ میں جکڑ رکھا ہے اور خاص طور پر ہمارے ملک میں جس طرح تیزی سے یہ وبا پھیلی اور لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے، اس نے لوگوں کے اوسان خطا کر دیے، زندگی کی رواں دواں گاڑی ٹھہر سی گئی اور ہر میدان میں انسان اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود سوچنے پر مجبور ہوا کہ ؎ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

معاشی زندگی کی بدحالی اپنی جگہ، تعلیم کے میدان میں پسپائی نے مستقبل کو تشویش ناک بنا دیا ہے، خاص طور پر مدارس اسلامیہ کے لیے یہ ایک انتہائی خطرناک موڑ ہے، اسلام میں تعلیم تربیت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، پہلی وحی میں "اقرأ" کہا گیا یعنی پڑھنے کا حکم ملا، لیکن "باسم ربك" کی شرط لگا دی گئی، گرچہ یہ شرط ہر دانش گاہ اور ہر کالج اور یونیورسٹی کے لیے ہے، لیکن مدارس میں جہاں اسی کی تعلیم دی جاتی ہے، اللہ کا نام سکھایا جاتا ہے، اس کے آداب بتائے جاتے ہیں، زندگی کی نوک پلک کو سنوارا جاتا ہے اور عالم انسانیت کے لیے وہ افراد تیار کیے جاتے ہیں جو زندگی کی ڈولتی کشتی کو بھنور سے نکالنا جانتے ہوں اور تعلیم و تربیت کے مراحل سے گذار کر جہاں سے علماء و ربانیین اور دعاۃ و مصلحین تیار کیے جاتے ہیں، ان اداروں کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔

انسان دیکھ کر سیکھتا ہے اور سمجھتا ہے، بغیر ساتھ رہے اس پر رنگ نہیں چڑھ سکتا، وہ کچھ نقالی کر سکتا ہے، لیکن اصل و نقل کا فرق دنیا جانتی ہے، آن لائن تعلیم سے وہ کچھ نقالی کر سکتا ہے مگر حقیقت سے دور، لیکن کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر "إِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ" بارش نہ ہو تو کچھ نمی ہی غنیمت ہے۔

جن مدارس نے آن لائن تعلیم جاری کی، وہ ایک طرف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سفر شروع کیا، لیکن یہ ایک پر خطر سفر ہے، پھونک پھونک کر قدم بڑھانے کی ضرورت ہے، طلبہ کے ہاتھوں میں ایک ایسی چیز تھما دی گئی ہے کہ وہ "یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد" کے مصداق ہیں، یہ بچھو بہت سوں کو ڈس رہا ہے، اس کے ڈنک سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے چلنا ہے، دوران درس طلبہ کو خطرات سے آگاہ کیا جاتا رہے اور ہمارے طلبہ بھی فکر مند رہیں، ضرورت سمجھ کر اس کا استعمال کریں، پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھائیں، اس کی کائی میں اگر پاؤں پھسل گیا تو نہ جانے نتیجہ کیا سے کیا نکلے، پھر اپنی تربیت کے لیے فکر مند رہیں، سیر و سوانح کی مفید و معتبر کتابوں کا مطالعہ اس سلسلہ میں بہت مفید ہے، قریب میں موجود علماء ربانیین سے بھی رجوع کریں، کچھ وقت ان کے ساتھ گذاریں تاکہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا نظام بھی کچھ نہ کچھ جاری رہ سکے۔

آن لائن اسباق توجہ سے سنیں اور اس کے لیے تیاری کر کے بیٹھیں، رواروی کا کام مضبوط نہیں ہوتا، کتابیں ساتھ رکھیں اور سبق کے بعد کتاب دیکھ کر اس کو تازہ کر لیں تو امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مجبوری کا نظام سہی لیکن فائدہ سے خالی نہیں ہوگا اور ایک تسلسل قائم رہے گا، بیچ کی کڑیاں کچھ کمزور سہی لیکن کڑیوں سے کڑیاں جڑتی جائیں گی اور انقطاع سے ہم محفوظ رہ سکیں گے۔ اس وقت بڑی ضرورت ہے مدارس میں نئی جان پیدا کرنے کی، ہمارا نصب العین کیا ہے؟ مدارس کو کیوں قائم کیا گیا اور ان کا دار ارقم اور صفہ نبوی سے جو تعلق رہا ہے وہ کیا ہے اور اس کو کس طرح مضبوط کیا جا سکتا ہے؟ تاکہ پھر وہی تاریخ دہرائی جا سکے جو ان ہی مدارس کے فارغین نے رقم کی تھی۔

نہ ہونا امید اے اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اس وقت دنیا جس مصیبت سے دوچار ہے، اللہ تعالیٰ جلد اس سے نجات دے اور ہمارے مدارس نئے حوصلوں اور نئے عزائم کے ساتھ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوں، یہ پاور ہاؤس جہاں سے انسانی آبادی میں روشنی تقسیم ہوتی ہے، پھر اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوں اور انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتی سیراب ہو۔ آمین!

لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مختلف زبانیں، تہذیبیں، تمدن اور طرزِ معیشت دنیا میں اس وقت سے ہیں جب سے انسان ہے، انسانیت نے ہمیشہ ان کے سایہ میں آرام اٹھایا، ان کی وجہ سے زندگی کا لطف بڑھا اور اس کے اندوختہ اور سرمایہ میں اضافہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنا یہ احسان یاد دلاتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ﴾ (اور اسی کے نشانات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا، اہل دانش کے لیے اس میں نشانیاں ہیں)

لیکن بنی نوع انسان کی طویل تاریخ میں جو اس قسم کے سنگین واقعات، المیوں اور مضحکہ خیز ڈراموں سے بھری ہوئی ہے، ہم کسی ایسی جنگ سے واقف نہیں جو صرف زبان اور کلچر کے لیے لڑی گئی ہو، عرب اپنے قوت بیان اور لسانی تعصب میں مشہور تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے سوا تمام لوگوں کو "عجمی" (گونگا) کہتے تھے، لیکن تاریخ نے کوئی ایک واقعہ ایسا ریکارڈ نہیں کیا جس میں عرب عجم سے کبھی اپنی زبان کی بنیاد پر لڑے ہوں، اسلام نے تو اس تعصب کو حرام وناجائز کہا تھا، اس کا نام "حمية جاهلية" رکھا تھا اور اس پر سخت نفریں کی تھی، اس کو جاہلیت کی قابل نفرت یادگار، کفر وبت پرستی کا رمز اور اللہ ورسول کے خلاف جنگ کے مرادف اور اس کے جھنڈے کے نیچے مرنے کو حرام موت یا جاہلی اور غیر اسلامی موت قرار دیا تھا، لیکن جاہلیت کی تاریخ میں بھی زبان کے مسئلہ میں ہمیں کسی ایسے معرکہ کا ذکر نہیں ملتا۔

یہ درحقیقت یورپ اور اس کی انتہا پسندانہ قوم پرستی کا فیض ہے، جس نے زبان اور کلچر کو یہ "مقدس" لباس عطا کیا ہے اور اس کو ایک ایسا بت بنا دیا ہے، جس کے لیے انسانوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اور خون بہایا جاتا ہے، اس کے نتیجہ میں اکثر ملکوں میں پرانی تہذیب کے احیاء کا شوق، زبان کا تعصب اور اس کے لیے مرمٹنے کا جذبہ پیدا ہوا اور لوگوں کو زبان کی ایک نئی صلیبی جنگ یا جاہلیت (Paganism) کا سامنا کرنا پڑا، جس کا تجربہ اب تک نہ ہوا تھا، یورپ کا یہ پروپیگنڈہ جو بڑی گہرائی اور دور بینی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا، ان مسلم اقوام میں بھی پوری طرح پھیل گیا، جو بہت صحیح العقیدہ، سلیم الفطرت اور دینی وایمانی جذبات کی حامل تھیں اور جن سے بجا طور پر یہ توقع تھی بلکہ یقین تھا کہ وہ اپنے دین اسلام اور سلامت فطرت کی وجہ سے کم از کم دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس لسانی وثنیت سے بہت دور رہیں گی، جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سند اور دلیل نہیں اور جس کی خدا کی میزان میں رائی کے دانہ کے برابر بھی قیمت نہیں۔

قرآن وحدیث کا ایک ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ کسی نسل، خون، رنگ، زبان، تہذیب کی بنا پر ادھار دھند حمایت اور جتھا بندی، اس کی بنیاد پر محبت ونفرت، تعلق اور قطع تعلق، صلح وجنگ، وہ جاہلی عصبیت ہے جس کی مذمت سے قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں: ﴿إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ (جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد کی اور ضد بھی جاہلیت کی)

اور صحیح حدیث میں آیا ہے: "وہ شخص جماعت مسلمین میں سے نہیں جو کسی عصبیت کی دعوت دے، وہ شخص جماعت مسلمین میں سے نہیں جو کسی عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے، وہ شخص جماعت مسلمین میں سے نہیں جس کی موت عصبیت پر ہو۔" (ابوداؤد)

درحقیقت زبانوں کا اختلاف بالکل قدرتی اور فطری ہے، بلکہ

اس کو قرآن مجید میں خدا کی ایک نعمت اور قدرت کی ایک نشانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، لیکن جب اس زبان کے معاملہ میں غلو و مبالغہ کیا جاتا ہے اور اس کی تقدیس شروع ہو جاتی ہے، اس کو معبود و مسجود بنا لیا جاتا ہے، تو وہ رحمت کے بجائے عذاب، تعمیر کا ذریعہ بننے کے بجائے تخریب کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کے استھان پر انسان اس طرح بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں' جیسے پہلے کبھی دیویوں اور استھانوں پر انسانوں کی قربانی کی جاتی تھی۔

زبان اس لیے ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑے، اس سے نکلا ہوا ایک لفظ مردوں میں جان ڈال دے اور محبت کے پھول برسائے، بیگانوں کو یگانہ، دور کو نزدیک اور دشمن کو دوست بنائے، اس کا کام نفرت پیدا کرنا، انگارے برسانا، بھائی کو بھائی سے جدا کرنا، نفرت کا زہر پھیلانا نہیں، اگر زبان سے یہی کام لیا جانے لگے تو اس سے گونگا اور بے زبان ہونا ہزار درجہ بہتر ہے اور انسان اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اگر دنیا کی سب قومیں اور قوموں کے تمام افراد گونگے پیدا ہوتے اور اشاروں سے باتیں کرتے تو شاید انسانیت کے حق میں یہ اس سے بہتر ہوتا کہ اپنی اپنی زبان کے غرور اور عشق میں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جائے، بے زبان عورتوں اور معصوم بچوں کو خاک و خون میں لٹایا جائے اور ملک کو تباہی و بربادی کے عمیق غار میں ڈھکیل دیا جائے۔

زبانیں انسانوں کے لیے بنی ہیں، انسان زبانوں کے لیے نہیں بنے ہیں، ایک انسانی جان کی قیمت' زبان و ادب کے پورے ذخیرے ہزاروں ادبی شاہکاروں، شعر و شاعری کے ہزاروں دفتروں اور فصاحت و بلاغت کے دریاؤں اور سمندروں سے زیادہ ہے، زبانیں پیدا ہوئیں اور مٹیں، سکڑیں اور پھیلیں، ان میں ہزاروں تبدیلیاں ہوئیں، لیکن انسان سدا سے ہے اور ہمیشہ انسان رہے گا۔

یاد رکھو! کسی زبان اور لٹریچر کا اسلامی روح' اسلامی تخیلات اور تعبیرات' اسلامی حقائق اور اصطلاحات سے نا آشنا ہونا اور دینی علوم کے خزانہ سے محروم رہنا بہت بڑا خطرہ ہے، زبان کا دل و دماغ اور روح و ضمیر سے قریبی تعلق ہے، جس زبان پر غیر اسلامی فکر اور غیر اسلامی ادب کا تسلط ہو، جس زبان پر غیر اسلامی چھاپ ہو، جس زبان کے بولنے والوں کے سوچنے کا طریقہ اور اپنے مطالب کے ادا کرنے کا انداز دوسرا ہوا، جس زبان کے استعارات و تشبیہات، محاورات و تلمیحات کسی مشرکانہ تہذیب یا فلسفہ سے ماخوذ ہوں اور وہی شخصیتیں، وہی کردار، وہی ادیب و شاعر، اسی کے مصلح اور داعی، اسی کے فلسفی اور مفکر اس کے لیے قابل تقلید اور آئیڈیل ہوں، اس کو اسلامی شخصیتوں سے اور جس فضا میں اسلام پھلا پھولا اس سے بیگانگی ہو، وہ قوم ہمیشہ ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا رہے گی اور اس کی جاہلی عصبیت کو ہر وقت بیدار کیا جاسکے گا، نسل پرستی اور زبان پرستی کا ایک نعرہ اس کو مجنون اور از خود رفتہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

آپ کا فرض ہے کہ آپ اس خطرہ کا سد باب کریں، ان زبانوں میں مہارت پیدا کریں، ان کی زبان و ادب کو نہ صرف اسلامیات سے مالا مال کردیں، بلکہ ان کی روح اور ضمیر کو مسلمان بنائیں اور ان کا مزاج اسلامی بنانے کی کوشش کریں، ان شخصیتوں کا رعب اور ان کا ذہنی تفوق دور کرنے کی کوشش کریں، جو ان کو اسلام سے دور اور مشرکانہ تخیلات سے قریب کرتی ہیں، ان میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان امتیاز کرنے، اول الذکر سے محبت اور آخر الذکر سے نفرت کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا کردیں کہ آئندہ کوئی جاہلی نعرہ اور زبان و نسل' ملک و وطن کی دہائی ان کو اسلام اور مسلمانوں سے کاٹ نہ سکے۔

اگر توفیق الٰہی سے آپ نے یہ فرض انجام دیا تو ملت اسلامیہ کے اس قیمتی خاندان کو جس میں ہزاروں کی تعداد میں علماء اور سینکڑوں کی تعداد میں اولیاء پیدا ہوئے اور جن کے اندر اب بھی اسلام سے محبت اور دین کے لیے حمیت پائی جاتی ہے اور جن کے اسلاف نے ماضی قریب میں تیرہویں صدی کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ وہ جانبازیاں اور سرفروشیاں دکھائیں جنھوں نے ڈاکٹر ہنٹر جیسے نقادوں کو بھی انگشت بدنداں بنا دیا، ایک جدید استحکام حاصل ہوگا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

نقطۂ نظر کا فرق

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

دنیا میں ہمیں دو نقطۂ نظر کے لوگ ملتے ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کو، اس کے احکام کو اور اس کے نبی کی تعلیمات کو مانتے ہیں، دنیاوی زندگی گذارنے میں ان کا نقطۂ نظر الگ ہے اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دنیادار ہیں، دنیا کمارہے ہیں اور دنیا میں عزت حاصل کررہے ہیں، ان کا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے، یعنی سارا معاملہ نقطۂ نظر کا ہے، بسا اوقات ممکن ہے کہ دنیادار لوگوں کا یہ نقطۂ نظر ظاہر میں زیادہ محسوس نہ ہورہا ہو، لیکن ظاہر کے پیچھے جو اصل ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں ظاہر نظر آتا ہے، اسی سے راستہ بنتا ہے اور اسی سے سارے نتائج پیدا ہوتے ہیں، وہ ان کا یہی تصور ہے کہ دنیا اور دنیا میں ہماری محنت ہی سب کچھ ہے۔ گویا دنیا اور دنیا کی 'محنت' یہ دو چیزیں اہل دنیا کا بنیادی نقطۂ نظر ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے سامنے جو کچھ دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ ہمیں حاصل ہے، اس سے زیادہ ہمیں کیا حاصل ہوسکتا ہے اور اس کے علاوہ مزید کیا ہوسکتا ہے؟ ان کے اس نظریہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں آخرت کا تصور بالکل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بہت ہی مدھم اور ہلکا ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان میں آخرت کا تصور بہت ہلکا ہوتا جارہا ہے، اب حال یہ ہے کہ آخرت کا تصور ان سے وہ کام نہیں کراسکتا جو ایک طاقتور کا تصور کراسکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب آخرت کا تصور کمزور ہوجاتا ہے تو وہ آدمی سے اس کام کو نہیں کراسکتا جو کرانا چاہیے۔ جن لوگوں کے یہاں آخرت کا تصور نہیں ہے وہ بالکل آزاد ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں جتنے دن ہیں یہی ہماری کل پونجی ہے، اگر ہم اس کو اچھی طرح نہیں گذاریں گے اور اس میں کامیاب نہیں ہوں گے تو ہم بالکل ناکام ہیں، کیونکہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جو کچھ ہے یہی ہے۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے زندگی گذارنے والے لوگ جب محنت کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ محنت سے بڑے بڑے کام انجام پاجاتے ہیں اور بڑے زبردست نتائج سامنے آتے ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کی زرق برق اور موجودہ تمدن جو ہمیں نظر آرہا ہے، یہ سب اسی محنت کا نتیجہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ آدمی اسی چیز کو دیکھ کر بہک جاتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسی کون سی چیز ہے جو ہم نہیں کرسکتے، ہم سب کچھ کرسکتے ہیں، ہم چاند تک چلے جاتے ہیں، ہم مریخ پر جانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، ہم دور دور کی باتیں سن لیتے ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں، ہم اپنے سارے مقاصد بہتر سے بہتر طریقہ پر پورے کرلیتے ہیں اور ظاہر ہے یہ تبھی ہے جب ہم محنت کرتے ہیں، جب ہم محنت کریں گے، اپنی عقل اور اپنے جسم کو استعمال کریں گے تو اسی حساب سے ہم کو نتائج بھی ملیں گے، اس کے علاوہ ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے، ہمارے لیے جو کچھ ہے یہ دنیا ہے اور اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ ہماری محنت اور ہماری سمجھ کا نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسی کئی مثالیں بیان کی ہیں جن سے انسان کی محنت اور اس کی حیثیت کی حقیقت کا صاف اندازہ ہوجاتا ہے۔ ایک جگہ اللہ نے قارون کی مثال دی جس کے پاس بڑی دولت تھی، ظاہر ہے وہ اتنی ساری دولت کہیں سے اٹھا کر نہیں لے آیا ہوگا، بلکہ اس نے بہت ذہانت اور حکمت ومحنت کے ساتھ کاروبار کیا ہوگا جس سے اتنی دولت پیدا ہوئی، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جیسی محنت کرے گا اور جیسی حکمت اختیار کرے گا اسی لحاظ سے نتائج بھی نکلیں گے، قارون بھی اپنی محنت اور حکمت کے نتیجہ میں اتنا بڑا دولت مند ہوگیا تھا کہ اسے دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے، قرآن میں اس کا ذکر ہے کہ لوگ کہتے تھے: ''کاش کہ ہمیں بھی وہ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل ہے یقیناً وہ تو بڑا نصیبہ والا ہے۔''

اہل دین حضرات تک یہ باتیں کہتے تھے کہ قارون کو دولت کا

بڑا حصہ ملا ہے، یہ اللہ کی نعمت ہے جس کو ملی ہے، کاش! یہ نعمت ہم کو بھی ملتی، لیکن قارون کا تصور یہ تھا کہ یہ سب دولت ہم نے اپنی دور اندیشی، محنت اور سمجھ کی بنا پر حاصل کی ہے، گویا ہم اس کے اہل تھے، اسی لیے ہمیں اللہ نے اس کا مستحق سمجھا اور ہمیں یہ سب کچھ مل گیا، یہی وجہ ہے کہ جب اس سے لوگوں نے کہا کہ تم اپنی کچھ دولت کارِ خیر میں بھی صرف کرو تو اس نے کہا: ہمیں یہ دولت ہماری محنت سے ملی ہے اور جو لوگ محنت نہیں کرتے ہیں وہ تکلیف اٹھاتے ہیں، لہٰذا ہم اپنی دولت دوسروں کو کیوں دیں، وہ لوگ خود محنت کیوں نہیں کرتے، جس طرح آج کل آدمی کسی فقیر محتاج سے کہتا ہے کہ تم خود کیوں نہیں کماتے، ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے، تم جاؤ اور کام کرو، ٹھیک اسی طرح قارون نے بھی کہا کہ ہم اپنی دولت سب لوگوں میں کیوں بانٹیں، یہ سب تو ہم نے اپنی ذاتی محنت سے حاصل کیا ہے۔

اہلِ دنیا کا یہ تصور اللہ کے عطا کردہ اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو اس نے اہلِ ایمان کو دیا ہے، دینِ اسلام کا تصور یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے، ہماری محنت کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا، اس لیے ہم کو مل گیا، اگر اللہ تعالیٰ ہماری محنت ہی قبول نہ کرتا تو ہماری محنت سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی نظام کو ذرائع سے مربوط کیا ہے، مگر یاد رہے کہ وہ ذرائع اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، ذرائع بالکل ویسا ہی کام کرتے ہیں جیسا ان کا نظام بنا دیا گیا ہے، تمام ذرائع اللہ کے حکم کے پابند ہیں اور اسی کے کہنے پر کام کرتے ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے کہ ذرائع کا تعلق اللہ سے کٹ گیا ہو، کٹ جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک چیز کسی کو دے دی اور یہ کہہ دیا کہ لو تم اسے جیسا چاہو استعمال کرو اور آپ خود اس سے فارغ ہو گئے، لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا سارا نظام ذرائع پر رکھا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام ذرائع اسی کے پابند ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے کہ وہ ذرائع کو انسانوں کے حوالہ کر کے فارغ ہو گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام اگر ذرائع پر نہ رکھا ہوتا تو حضور ﷺ کو جنگ میں جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، بلکہ بغیر جائے ہی اللہ کی طرف سے جیت کا فیصلہ ہو جاتا، اللہ تعالیٰ کفار کو پسپا کر دیتا اور ان میں ایسا رعب پیدا کر دیتا کہ وہ حملہ کرنے آتے ہی نہیں، لیکن اللہ نے سب کچھ ذرائع کے ذریعہ سے کروایا، حکم دیا کہ جاؤ لڑو اور قربانی دو اور اپنی جانیں صرف کرو اور پھر کامیابی اس طرح حاصل کرو جس طرح دوسرے لوگ حاصل کرتے ہیں، اس میں تم میں اور کافروں میں فرق نہیں ہوگا، بلکہ جو محنت کرے گا وہ حاصل کرے گا، مگر ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ کہہ کر اپنے برگزیدہ بندوں کو نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اس نے ان پر نظر رکھی اور ان کی نیتوں کو دیکھ کر غیب سے ان کی مدد فرمائی، اس نے میدانِ جنگ میں فرشتے بھیجے، جنھوں نے آکر شکست دی اور یہ سب اس لیے ہوا کہ اللہ نے دیکھ لیا تھا کہ انہوں نے واقعی حق ادا کر دیا ہے، انہوں نے میدانِ جنگ میں ذرائع استعمال کیے لیکن ایمان و یقین سو فیصد اللہ کی ذات اور اس کی مدد پر رہا، وہ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے ذرائع استعمال کرنے سے کام نہیں چلے گا، انہیں تو ہم اللہ کے حکم سے اختیار کر رہے ہیں، اصل کام تبھی ہوگا جب اللہ چاہے گا، جب اللہ نے ان کے ایمان کی اس اعلیٰ درجہ کی کیفیت کو دیکھا تو ان کی مدد فرمائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کا یہی نظام رکھا ہے کہ اگر اللہ کی ذات پر بھروسہ ہوگا تو اللہ مدد کرے گا، لیکن اللہ کی مدد ذرائع کے ذریعہ ہوگی اور ذرائع اللہ کے تابع ہیں، ان میں خود اپنی کوئی صلاحیت نہیں ہے، امراض میں ہم جو دوائیں استعمال کرتے ہیں، وہ دوائیں خود کوئی اثر نہیں رکھتی ہیں، بلکہ اللہ کا دیا ہوا اثر رکھتی ہیں، اگر اللہ چاہے تو ان کا اثر واپس لے سکتا ہے، اس لیے کہ دوا اپنے اثر کی مالک نہیں ہے، بلکہ اس میں اللہ نے اثر ڈالا ہے اور اس اثر کا مالک اللہ ہے، جب چاہے وہ اثر واپس لے لے اور دوا بے کار ہو جائے۔

ٹھیک اسی طرح انسانوں کا معاملہ ہے کہ ان کا سب کام اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے اور اللہ یوں ہی توفیق نہیں دیتا، بلکہ پہلے وہ بندہ کی نیت اور اس کا جذبہ دیکھتا ہے، پھر اسی لحاظ سے اللہ کی مدد ہوتی ہے۔

مسلسل

سچائی کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دل کی حیثیت:

انسانی جسم میں دل کی حیثیت بادشاہ کی ہے اور دماغ اس کا وزیر اعظم ہے، لہٰذا دل میں جو خیالات آتے ہیں اور دل جو فیصلے کرتا ہے، دماغ اس کی تنفیذ کرتا ہے اور تنفیذ کے لیے اسباب تلاش کرتا ہے، مثلاً: دل چاہ رہا ہے کہ ہم فلاں کام کریں، مگر وہ کام کیسے کرنا ہے؟ اس کی راہ دماغ نکالے گا اور اس کے راستے تلاش کرے گا کہ یہ کس طرح ممکن ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ کام صحیح ہو یا غلط۔ چونکہ دل بادشاہ ہے لہٰذا اس کی بڑی قیمت ہے اور اسی لیے اس پر محنت کی بڑی ضرورت ہے، اگر دل میں غلط خیالات آئیں گے اور دل غلط راستہ کی طرف لے جانا چاہے گا تو انسان کے لیے بچنا بڑا مشکل ہوگا، لہٰذا دل کو قابو میں رکھنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ اس کے بارے میں بھی اللہ کے یہاں سوال ہوگا، ایک حدیث میں دل کو سب سے بنیادی چیز بتایا گیا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"صاف سن لو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو تو پورا جسم درست ہے اور اگر وہی خراب ہو جائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے، سنو! وہ (ٹکڑا) دل ہے۔" (سنن ابن ماجہ)

ظاہری جسم کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے کہ آدمی کا دل کام نہ کرے تو اس کا جسم فیل ہو جائے گا، ٹھیک اسی طرح باطنی اعتبار سے بھی دل کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اگر دل ٹھیک ہے، دل میں اللہ کی محبت ہے، شریعت کی عظمت اور اس کا احترام ہے اور اس پر عمل کا جذبہ ہے تو انسان کا پورا جسم اس کی تابعداری کرتا ہے اور شریعت کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، لیکن اگر دل کے اندر غلط خیالات آرہے ہیں اور دل آدمی کو غلط راستہ کی طرف لے جا رہا ہے تو ظاہر ہے جسم دل کا تابع ہے، وہ جو فیصلہ کرے گا جسم اسی پر عمل کرے گا، معلوم ہوا دل کا مسئلہ بہت اہم ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں دل کے بارے میں بھی خاص طور سے سوال ہوگا۔

وسوسوں کا حکم:

دل کے اندر جو وسوسے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، اللہ کے یہاں ان پر کوئی سوال اور پکڑ نہیں ہوگی، لیکن جو وسوسے آرہے ہیں ان کی بنیاد پر اگر کوئی شخص عمل کا عزم کرلے، یا ان وسوسوں سے فائدہ اٹھانے لگے تو پھر یہ خطرہ کی بات ہے، حدیث میں ہے: "اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو معاف کردیا ہے، جب تک کہ وہ انہیں عمل یا زبان پر نہ لائیں۔" (صحیح بخاری)

حدیث سے پتہ چلا کہ وسوسے پر عمل کرنے کے بعد اللہ کے یہاں گرفت ہوگی، اس لیے کہ اب وہ وسوسہ محض وسوسہ نہیں رہ گیا، بلکہ اس پر عمل بھی ہو گیا اور اعمال جسم کے بھی ہوتے ہیں اور دل کے بھی ہوتے ہیں، جیسے بغض، کینہ، حسد، ریاکاری، ظاہر ہے یہ سب اعمال ہی ہیں لیکن یہ اعمال دل کے ہیں، حسد آدمی دل سے کرتا ہے، پھر جسم سے اس کا مظاہرہ ہوتا ہے، بغض دل سے ہوتا ہے، جسم سے اس کا مظاہرہ ہوتا ہے، ریاکاری دل سے ہوتی ہے اور اس کا مظاہرہ جسم سے ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے، معلوم ہوا فلاں صاحب دیکھ رہے ہیں، لہٰذا اب نماز میں اور زیادہ خشوع وخضوع پیدا کرلیا گیا، تاکہ اور بزرگ سمجھا جاؤں، گویا جو ریاکاری پیدا ہوئی وہ دل سے پیدا ہوئی، اس کا محل قلب ہے اور اس کے بعد پھر جسم نے اس پر عمل کرنا شروع کردیا، غرض کہ ایسے بہت سے اعمال ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے اور دل اس کا محل ہے۔

اصلاح کا پہلا مرحلہ:

اصلاح باطن کا سب سے پہلا مرحلہ دل کو سلامت رکھنا اور دل کو قابو میں رکھنا ہے، ذکر کا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی جب ذکر کرتا ہے اور دل پر اللہ اللہ کی ضربیں لگاتا ہے، لا الہ الا اللہ کا ورد کرتا ہے اور دل کو اس میں مشغول کرتا ہے، تو اس سے دل سنورتا ہے، حضرت

مولاناؒ فرماتے تھے کہ دل کی حیثیت زمین کی ہے، جیسے زمین ہوتی ہے، ویسے ہی دل ہے، تم اس پر جیسی محنت کروگی ویسے ہی برگ وبار لائے گی، ایسے ہی دل کی زمین پر جیسی محنت کی جائے گی دل ویسے ہی برگ وبار لاتا ہے، اگر دل پر محنت کی جائے گی، ہل چلایا جائے گا، اس کی زمین کو نرم کیا جائے گا، اچھے بیج ڈالے جائیں گے، اس کی آبیاری کی جائے گی تو اس کے نتیجہ میں اچھے اخلاق پیدا ہوں گے، اچھی صفات پیدا ہوں گی، اچھے اعمال کا ظہور ہوگا اور اگر اس کو خالی چھوڑ دیا جائے گا تو ظاہر ہے کانٹے پیدا ہوں گے اور دل کی زمین بالکل برباد ہوکر رہ جائے گی، پھر اس کا نتیجہ جسم کی برائیوں کی شکل میں ظاہر ہوگا اور آدمی غلط راستہ کی طرف جائے گا۔

عام طور پر آدمی جو غلط زبان استعمال کرتا ہے اس کے پیچھے کان' آنکھ اور دل کا بنیادی کردار ہوتا ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ ان تینوں اعضاء کے متعلق قیامت میں پوچھا جائے گا۔ کان کوئی اڑتی ہوئی بات سن لیتا ہے، آنکھ دور سے کوئی چیز دیکھ لیتی ہے اور دل میں بعض مرتبہ کچھ ایسی چیزیں آجاتی ہیں، جن کا زبان فوری طور پر مظاہرہ شروع کردیتی ہے اور اس سلسلہ میں مبالغہ کے ساتھ کہنا شروع کردیتی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زبان دل کا چمچہ ہے، دل میں جو ہوتا ہے' وہ اس کو باہر لاتی ہے، جیسے آدمی چمچہ کے ذریعہ ہانڈی سے سالن نکالتا ہے اور اندر سے باہر لاتا ہے، ٹھیک اسی طرح زبان دل کے خیالات باہر لاتی ہے، لہٰذا یہ فیصلہ آدمی کو کرنا ہے کہ کیا چیز باہر لانا ہے اور کیا نہیں لانا، کیا رکھنا ہے اور کیا نہیں رکھنا۔

دل کی مثال:

دل میں غلط خیالات کا آنا کوئی معیوب بات نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان خیالات کو آتے ہی آگے بڑھا دیا جائے اور روک کر نہ رکھا جائے، اسی لیے دل کی حیثیت ایک سڑک کی طرح بتائی جاتی ہے جس پر ٹریفک چل رہا ہے اور ایک گاڑی آرہی ہے، دوسری اور تیسری آرہی ہے، اگر یہ ٹریفک جام ہوگیا تو مصیبت آجائے گی، اس سڑک پر جو آرہا ہے اس کو فوراً آگے جانے دیا جائے، روکا ہرگز نہ جائے، اگر اس میں وسوسوں اور غلط خیالات کے بڑے بڑے گھر پیدا ہوگئے تو ٹریفک جام ہوجائے گا، خیالات جیسے ہی آئیں تو فوراً نکل بھی جانا چاہیے، ان کا باقی رکھنا نہایت مضر ہے۔

ایمان کی علامت:

احادیث میں ہے کہ آدمی کے دل میں برے خیالات آتے ہیں اور وہ ان کو برا سمجھتے ہوئے فوری طور پر ذہن سے باہر نکال دیتا ہے تو یہ ایمان کی علامت ہے، ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم میں سے بعض لوگ اپنے دل میں ایسے وساوس پاتے ہیں کہ ان کو زبان پر لانے کے مقابلہ میں آدمی یہ زیادہ پسند کرے کہ وہ جل کر کوئلہ بن جائے یا آسمان سے زمین پر گر جائے۔

(جامع الاصول فی أحادیث الرسول: ۱/۲۴۳)

آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "ذلك محض الإيمان" (یہی تو عین ایمان ہے)

انسان کے دل میں ہزار قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں، ظاہر ہے خیالات کا آنا برا نہیں ہے، لیکن خیالات کو باقی رکھنا اور ان میں غور کرنا گناہ کی بات ہے، اگر آدمی کو برے خیالات آرہے ہیں، مثلاً: اللہ کے بارے میں یا کفر وشرک کے بارے میں اور آدمی ان خیالات کو برا سمجھ رہا ہے تو بس یہی ایمان کی علامت ہے، لیکن اگر خدانخواستہ انسان ان میں غور کرنے لگا تو یہ خطرہ کی چیز ہے، کیونکہ شیطان ہر شخص کو بہت دور سے بہکاتا ہے، وہ شروع یہاں سے کرتا ہے کہ فلاں چیز سے پہلے کیا چیز تھی اور فلاں سے پہلے کیا تھا؟ پھر یہاں تک لے جاتا ہے کہ اللہ سے پہلے کیا تھا؟ ظاہر ہے آدمی کی عقل جب یہاں تک پہنچے گی اور وہ سوچنا شروع کرے گا تو وہ گمراہی کی طرف چلا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے دل میں فحش خیالات آرہے ہیں اور وہ ان میں مزے لے رہا ہے تو یہ گناہ کی بات ہے، ان خیالات کا آنا غلط نہیں ہے، خیال فوری طور پر آتا ہے جس کا فوری طور پر نکالنا ضروری ہے، اگر وہ نکل گیا تو سڑک صاف ہوگئی اور اگر گاڑی روک دی تو وہاں معاملہ گڑبڑ ہوجائے گا۔

صبر واستقامت کا پیکر مثالی

عبدالسبحان ناخداندوی

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء اللہ کے خلیل، جلیل القدر نبی، تمام قوموں کے پیشوا، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے جد امجد ہیں، جن پر یہود ونصاری اور عرب سب متفق ہیں، توریت کے لحاظ سے آپ کا نسب نامہ یوں ہے: ابراہیم بن تارح (عربوں کے نزدیک یہی آزر ہے) بن نامور بن سروح بن رعو بن فالح بن عابر بن شالح بن ارذکشاد بن سام ابن نوح۔

اس لحاظ سے آپ دسویں پشت پر حضرت نوح سے جا ملتے ہیں، کلدانی زبان میں ابراہیم کا مطلب "أب رحیم" کا ہے، حضرت ابراہیم کی نرمی، شفقت اور بندگان خدا کے ساتھ انتہائی درد مندی کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے یہ مطلب قرین قیاس لگتا ہے، صحیح احادیث یہ بتاتی ہیں کہ خواب میں آنحضرت ﷺ نے آپ کو اس طرح دیکھا کہ ایک گھنے درخت کے سایہ میں تنے سے ٹیک لگائے تشریف فرما ہیں اور ارد گرد بچوں کی ایک کثیر تعداد ہے، گویا ایک شفیق بزرگ ہوں جو تمام بچوں کے لیے گھنے سایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کیفیت اور آپ کے اسم مبارک کے مطلب میں انتہائی یکسانیت نظر آتی ہے۔ ملک بابل میں آپ کی پیدائش ہوئی جو اس زمانہ میں عراق کہلاتا ہے، جس شہر میں آپ کی پیدائش ہوئی اسے "اُور" کہا گیا ہے، موجودہ تحقیق کے لحاظ سے یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایہ تخت بغداد کے درمیان میں واقع تھا۔

۱۹۹۶ قبل مسیح آپ کا سنہ ولادت ہے، آپ ایک بت پرست گھرانے میں پیدا ہوئے، پوری قوم بت پرستی، بت گری اور بت فروشی میں ڈوبی ہوئی تھی، چاند ستارے اور سورج کی پرستش ہوتی تھی، بادشاہ بھی خدائی کا دعویدار تھا اور قوم اسے بھی زمینی خدا کی حیثیت دیتی تھی، آپ کا باپ آزر مشہور بت گر و بت فروش تھا، ایسے گندے ماحول میں آپ پاک وصاف پروان چڑھے، بھری جوانی میں اللہ نے نبوت سے نوازا، شرک کی اس گھٹاٹوپ تاریکی میں آپ نے توحید کی شمع روشن کی، پھر سرزمین شام کی طرف ہجرت فرمائی، وہاں سے مصر پھر حجاز تشریف لائے، وہیں اللہ کے گھر کی بنیاد رکھی، اس کے بعد بظاہر شام میں آپ کا مستقل قیام رہا، البتہ حجاز آنے کا سلسلہ جاری رہا جو آپ کے فرزند اکبر حضرت اسماعیل کا وطن تھا، اپنی نسل کی اس شاخ کو آپ ہی نے بحکم خداوندی مکہ کی بے آب وگیاہ زمین میں آباد فرمایا تھا، ۱۷۹۳ قبل مسیح میں آپ نے سرزمین شام میں وفات پائی، قرآن میں متعدد مقامات پر آپ کا ذکر موجود ہے۔

حضرت ابراہیم وہ عظیم شخصیت ہیں جو سراپا قربانی ہیں، جس کی تصدیق قرآن نے ان بلند ترین الفاظ میں کی ہے: ﴿وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ (ابراہیم تو وہ ہے جس نے وفا کا حق ادا کر دیا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گھر کا ناموافق بلکہ انتہائی نامانوس ماحول دیا گیا، انہیں شرک سے سخت نفرت تھی، دوسری طرف آپ کا باپ بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر و بت فروش بھی تھا، ایک طرف حضرت ابراہیم کی دل سوزی اور تڑپ و بے چینی اس قدر کہ باپ کو ایمان کی طرف راغب کرنے کی ہر کوشش کر ڈالی، دوسری طرف اکھڑ اور بدمزاج باپ جس نے صرف یہی نہیں کیا کہ بات نہیں مانی، بلکہ اپنی دعوت سے باز نہ آنے پر سنگسار کر دینے تک کی دھمکی دے ڈالی، کسی کو قتل کرنے کا انتہائی خطرناک طریقہ سنگساری کا تھا، اس سے باپ کی نفرت اور انتہائی درجہ کی قساوت معلوم ہوتی ہے: ﴿قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا﴾ ذرا یہ تیور دیکھئے: (ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے نفرت رکھتا ہے، اگر تو باز نہ آیا تو سن تجھے میں خود پتھر مار مار کر فنا کر دوں گا) ایسی گھریلو زندگی جہاں باپ خود خون کا پیاسا بن جائے کتنی بڑی آزمائش تھی۔

دوسری طرف قوم تھی، جس کے سامنے حضرت ابراہیم نے معقول طریقہ پر بات رکھی تو وہ کٹ حجتی پر اتر آئی (باقی صفحہ ۱۳ پر)

عشرۂ ذی الحجہ اور قربانی کے احکام

مفتی راشد حسین ندوی

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل: جس طرح رمضان کے مہینہ کے بے شمار فضائل کتاب وسنت میں وارد ہوئے ہیں، اسی طرح عشرۂ ذی الحجہ کے بھی کثرت سے فضائل وارد ہوئے ہیں، قرآن مجید میں دس راتوں کی قسم کھائی گئی ہے، جمہور مفسرین کے نزدیک ان دس راتوں سے مراد ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ اگر کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو اس سے اس کی اہمیت بتلانا مقصود ہوتا ہے، اس کے علاوہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی بھی دن ایسے نہیں ہیں جن میں نیک کام کرنا (عشرۂ ذی الحجہ کے) ان دس دنوں سے زیادہ اللہ کو محبوب ہو، صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے راستہ میں جہاد بھی نہیں؟ فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد بھی نہیں، سوائے اس شخص کے جو اپنا جان اور مال لے کر نکلا ہو اور ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز لے کر نہ لوٹا ہو۔

اسی طرح ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عشرۂ ذی الحجہ کے مقابلہ میں سال کے کوئی ایام بھی ایسے نہیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کو عبادت زیادہ پسند ہو، اس کے ایک دن کا روزہ ایک سال روزہ رکھنے کے برابر ہے، اور اس کی ہر رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ (ترمذی نے حدیث کو سنداً ضعیف قرار دیا ہے)

خاص طور سے ان ایام میں عرفہ یعنی ۹/ذی الحجہ کا روزہ غیر حاجیوں کے لیے بڑی فضیلت والا ہے، چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں حضرت ابوقتادہؓ کی طویل حدیث نقل کی گئی ہے، جس میں یہ جملہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یوم عرفہ کے روزہ کے بارے میں مجھے اللہ سے امید ہے کہ ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے لیے گناہوں سے کفارہ بنے گا۔

تکبیر تشریق: یوم عرفہ یعنی ۹/ذی الحجہ کی فجر کی نماز سے لے کر تیرہویں تاریخ کی عصر تک ایک مرتبہ تکبیر تشریق بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے، خواہ جماعت سے نماز پڑھے یا انفرادی طور پر اور خواہ مقیم ہو یا مسافر، یہ تکبیر پڑھنا عورتوں پر بھی واجب ہے لیکن وہ آہستہ آواز سے تکبیر پڑھیں گی۔ (فتاوی ہندیہ: ۱/۱۵۲، شامی: ۱/۶۱۹)

چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یوم عرفہ کی صبح کو جب فجر کی نماز پڑھ لیتے تو صحابہ کی طرف رخ کرتے اور فرماتے: اپنی جگہ پر رہو اور پڑھتے:

"اللہ أکبر اللہ أکبر لا الہ الا اللہ واللہ أکبر اللہ أکبر و للہ الحمد. (سنن دار قطنی، باب العیدین)

قربانی کی فضیلت: قربانی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علی نبینا وعلیہما السلام کے عظیم عمل کی یادگار ہے، ان کا قصہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے اور معروف ومشہور ہے، اللہ کو ان کا عمل بہت پسند آیا اور اس کی یاد کو قیامت تک باقی رکھنے کے لیے امت محمدیہ پر قیامت تک کے لیے قربانی کو واجب قرار دیا، چنانچہ ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت زید بن ارقمؓ کے حوالہ سے حدیث وارد ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا: اللہ کے رسول! یہ قربانی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابہ نے پوچھا: ہمارے لیے اس میں کیا ثواب ہے؟ فرمایا: ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی۔

قربانی کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی عمل قربانی سے زیادہ محبوب نہیں ہوتا، چنانچہ ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے آنحضرت ﷺ کا فرمان منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: قربانی کے دن قربانی کے مقابلہ میں آدم کے بیٹے کا کوئی بھی عمل اللہ کے نزدیک محبوب نہیں ہے، قیامت کے دن وہ

جانور کی سینگ، بال اور کھروں کو لے کر آئے گا، اور خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی اللہ کے یہاں مقبولیت حاصل کر لیتا ہے، لہٰذا تم اس کو خوش دلی سے کیا کرو۔

قربانی کا وجوب: احناف کے نزدیک جب وجوب کی شرائط پائی جائیں تو قربانی واجب ہو جاتی ہے، چنانچہ مستدرک حاکم میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: جو خوشحالی کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ نہ آئے۔ ظاہر ہے اس طرح کی تاکید واجب ہی کے لیے ہو سکتی ہے۔

وجوب کی شرائط: قربانی اسی وقت واجب ہوتی ہے جب مندرجہ ذیل تین شرطیں پائی جائیں:

۱- مسلمان ہو، غیر مسلم پر قربانی واجب نہیں ہوتی۔ ۲- ایام قربانی میں مقیم ہو، خواہ اپنے وطن میں ہو، خواہ کسی جگہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ کے لیے مقیم ہو، چنانچہ حالت سفر میں قربانی واجب نہیں ہوتی۔ ۳- ایام قربانی میں صاحب نصاب ہو، یعنی دو سو درہم چاندی (جو ۶۱۲ گرام ۳۶۰ ملی گرام) کے بقدر ہوتی ہے) یا ۲۰ مثقال سونا (جو ۸۷ گرام ۴۸۰ ملی گرام) کے بقدر ہوتا ہے، یا ان دونوں چیزوں میں سے کسی چیز کے بقدر روپیہ پیسہ یا مال تجارت ہو، زکوۃ میں بھی اتنی مالیت کا مالک ہونے پر صاحب نصاب قرار پاتا ہے، لیکن قربانی اور زکوۃ کے صاحب نصاب میں دو چیزوں میں فرق ہوتا ہے، ایک یہ کہ زکوۃ میں مال پر سال گزرنا شرط ہے، جب کہ قربانی کے وجوب کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ ایام قربانی میں مذکورہ مالیت کا مالک ہو، سال گزرا ہو یا نہ گزرا ہو، دوسرا فرق یہ ہے کہ زکوۃ تبھی فرض ہوتی ہے جب مال "نامی" (بڑھنے والا مال) کا مالک ہو، یہ شرط قربانی کے وجوب کے لیے نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی کے پاس حاجت اصلیہ سے زیادہ جائیداد ہو تو اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوگی، لیکن قربانی واجب ہو جائے گی، مثلاً ایک مکان ہو جس میں رہتا ہو تو وہ حاجت اصلیہ میں لگا ہوا ہے، لہٰذا نہ زکوۃ واجب ہوگی نہ قربانی، لیکن اگر ایک مکان اور ہو جو کرایہ پر رکھا ہوا ہے یا خالی پڑا ہے، اور اس کی مالیت نصاب تک پہنچ رہی ہے تو قربانی واجب ہو جائے گی، لیکن زکوۃ واجب نہیں ہوگی، اس لیے کہ جائیداد مال نامی نہیں ہے۔ (شامی: ۵/۲۱۹، ہندیہ: ۵/۲۹۲)

قربانی کے ایام: احناف کے نزدیک ایام قربانی تین دن ہیں یعنی دس گیارہ اور بارہ ذی الحجہ، اس کا وقت ۱۰ ذی الحجہ کو طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے، اور ۱۲ ذی الحجہ کو سورج غروب ہونے سے پہلے تک رہتا ہے، لیکن جن شہروں قصبوں اور بستیوں میں نماز عید ہوتی ہے، ان میں عید کی نماز سے پہلے قربانی صحیح نہیں ہوتی، اس لیے کہ بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت میں حضرت جندبؓ بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز پڑھنے سے پہلے قربانی کر لی وہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے۔

البتہ جہاں نماز عیدین کی شرائط نہیں پائی جاتی ہیں اور عید کی نماز نہیں ہوتی ہے، وہاں طلوع فجر ہوتے ہی قربانی کی جا سکتی ہے، شہر والے بھی ایسے دیہات میں جانور بھیج دیں تو قربانی طلوع فجر کے بعد ہی صحیح ہو جائے گی، اس لیے کہ یہاں اعتبار اس جگہ کا کیا جاتا ہے، جہاں جانور موجود ہے۔

(شامی: ۵/۲۱۹-۲۲۳-۲۲۴، ہندیہ: ۵/۲۹۵)

ان تین دنوں میں پہلے دن قربانی کرنا افضل ہے۔ (ایضاً)

ان تین دنوں میں رات اور دن میں کسی وقت بھی قربانی کر سکتا ہے، لیکن رات میں چونکہ اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ تمام رگیں اچھی طرح نہ کٹ سکیں، اس لیے فقہاء نے رات میں قربانی کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے، اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ اگر روشنی کا معقول انتظام ہو اور اس طرح کا کوئی خطرہ نہ ہو تو رات کو بھی بلا کراہت قربانی کی جا سکتی ہے، لیکن ذہن میں رہنا چاہیے کہ رات سے مراد دس اور گیارہ نیز گیارہ اور بارہ تاریخ کی درمیانی دو راتیں ہیں۔

(شامی: ۵/۲۲-۲۲۵، ہندیہ: ۵/۲۹۵)

جب عید کی نماز نہ ہو سکے: اگر نماز عید پہلے دن کسی عذر کی وجہ سے نہ ہو سکے، مثلاً چاند کی شہادت زوال کے وقت ملی یا اتنی تیز بارش ہوئی کہ نماز عید پڑھنا ممکن نہ تھا تو نماز عید دوسرے دن پڑھی جائے گی، اس لیے کہ اس کا وقت زوال سے پہلے ہی تک

رہتا ہے، لیکن قربانی زوال بعد کرنا جائز ہے، اس کے برخلاف فرقہ وارانہ فساد اور کرفیو کی وجہ سے نماز عید نہ ہوسکے تو طلوع فجر کے بعد زوال سے پہلے بھی قربانی کی جاسکتی ہے، اگرچہ افضل یہی ہے کہ زوال کے بعد قربانی کرے۔ (شامی: ۵/۲۲۴، ہندیہ: ۵/۲۹۵)

جب شہر میں نماز عید کئی جگہ ہوتی ہو: آج کل شہروں میں کئی جگہ عیدین کی نماز ہوتی ہے، عیدگاہوں میں بھی ہوتی ہے اور مختلف مساجد میں بھی ہوتی ہے، تو اگر کسی ایک جگہ نماز ہوجائے تو پورے شہر والوں کے لیے قربانی کرنا صحیح ہوجائے گا، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ خود پڑھنے کے بعد اور عیدگاہ میں نماز ہوجانے کے بعد قربانی کرے۔

(بدائع: ۴/ ۲۱۱-۲۱۲، ہندیہ: ۵/ ۲۹۵-۲۹۶، فتاوی رحیمیہ: ۶/ ۱۸۰، کتاب المسائل: ۲/ ۲۱۶-۲۱۷)

دوسری جگہ قربانی کرانا: جہاں پر ایک شخص مقیم ہے اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ قربانی کرانا جائز ہے، چاہے مقصد یہ ہو کہ قربانی کم رقم میں ہوجائے، اور چاہے اس کے گھر کے دوسرے افراد وہاں موجود ہوں اور وہ چاہتا ہو کہ اس کی قربانی کے جانور سے وہ فائدہ اٹھائیں اور چاہے مقصد کسی مدرسہ اور ادارہ کی مدد ہو کہ وہاں قربانی کرانے پر ان کو کھال حاصل ہوجائے گی، اس صورت میں جہاں جانور ذبح کرنا ہے، وہاں کے ایام اور اوقات کا خیال رکھنا ضروری ہے، مثلاً ممبئی والے نے لکھنؤ میں قربانی کرائی تو لکھنؤ میں نماز عید ہوجانے کے بعد قربانی کرائی جائے گی، ممبئی میں نماز ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، یہی معاملہ ایام کا بھی ہوگا، جہاں جانور ہے وہاں ایام قربانی ہونا چاہیے۔ (ہندیہ: ۵/ ۲۹۶)

البتہ فقہ اکیڈمی کی تجاویز میں ہے کہ جس شخص کی طرف سے قربانی کرائی جارہی ہے، اگر اس کے یہاں دس ذی الحجہ شروع نہیں ہوئی تو اس کی طرف سے قربانی نہیں کی جاسکتی، اگرچہ قربانی کیے جانے کے مقام پر اس دن دس ذی الحجہ ہو، لہٰذا الگ قربانی کرانے میں اس تجویز کا خیال رکھنا چاہیے۔

بقیہ: صبر واستقامت کا پیکر مثالی

معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم میں بدمزاجی، اکھڑ پن، اور نافرمانی کا مزاج تھا، حضرت ابراہیم کی دعوت پر قوم کا جواب یہ تھا: ﴿قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ﴾ (انہوں نے کہہ دیا: ابراہیم کو مار ڈالو یا جلاڈالو) کسی بھی بات پر ادنی درجہ غور کرنے کو بھی قوم تیار نہ ہوسکی، بلکہ اس کے نزدیک ہر بات کا علاج تلوار یا آگ تھی۔

تیسری طرف بادشاہ تھا، وہ تو اور گیا گذرا تھا، اس کا دعوی یہ تھا وہ موت وحیات کا مالک ہے، اسے بھی حضرت ابراہیم نے اس طرح لاجواب کردیا کہ مبہوت ہوکر رہ گیا، لہٰذا یہ بھی غم وغصہ میں پاگل تھا، یہ اللہ کے وہ امتحانات تھے جو حضرت ابراہیم کو اپنی زندگی کے ان دنوں میں پیش آئے جو ایک انسان کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہوتے ہیں، جسے بے فکری کا زمانہ کہا جاتا ہے، وہاں ابراہیم کا کوئی نہ تھا، نہ باپ، نہ گھر، نہ قوم، نہ بادشاہ!

حضرت ابراہیم کا آخر عمر میں سب سے بڑا اور آخری امتحان، جو امتحان اللہ نے شاید کسی کا نہ لیا ہوگا، یہ تھا کہ حکم ہوتا ہے اپنے بارہ تیرہ سال کے اکلوتے فرزند کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرڈالو، ۹۷-۹۸ سال کی عمر، ایک اکیلا بیٹا، آئندہ اولاد کی بظاہر کوئی امید نہیں، اسے صرف قربان ہی نہیں کرنا ہے، بلکہ اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا ہے، زمین وآسمان دم بخود، پوری کائنات ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے کہ صدق ووفا کی کون سی تاریخ رقم ہونے جارہی ہے، دنیائے انسانیت کی اصل پہچان کیا ہوگی، سچائی اور وفاداری یا پھر بزدلی وبے ہمتی، لیکن عشق کی ایک جست نے طے کردیا تمام قصہ، اکلوتے سعادت مند فرزند کے پاک وصاف گلے پر بوڑھے ابراہیم نے چھری پھیر کر بتادیا کہ محبت الٰہی میں انسان کہاں تک اوپر اٹھ سکتا ہے۔ خود اللہ نے آواز دی، ﴿وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ☆ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ☆ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ﴾ (ہم نے ابراہیم کو پکارا، ابراہیم تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نہایت کھلی ہوئی آزمائش تھی)

حج تربیت کا بہترین مظہر

محمد امین حسنی ندوی

حج اسلامی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے اور جس کی بڑی اہمیت ہے، اس کے اثرات حج کرنے والے پر بلکہ اس کے اہل خانہ پر اور اس سے آگے بڑھ کر اس سماج پر جس میں وہ رہتا ہے بڑے گہرے پڑتے ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران: ۹۷) ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

حج ایک ایسی عبادت ہے جس سے انسان کے اندر بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے، حج سے جہاں انسان اپنے رب سے قرب محسوس کرتا ہے وہیں دوسری طرف اسے دنیا کی حقیقت و بے ثباتی کا علم بھی ہوتا ہے، احرام کی دو سفید چادریں اس کو موت کا منظر یاد دلاتی ہیں اور سفید چادروں میں ملبوس میدان عرفات میں حاجیوں کا وہ جم غفیر میدان محشر کا منظر نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے۔

حج میں لوگ مختلف ملکوں سے مختلف علاقوں سے، رنگ و نسل کے فرق کے ساتھ مقام عرفات میں جمع ہوتے ہیں، ایک طرح کے لباس میں، گرد و غبار میں اٹے، اپنی اولاد، اپنی دولت اور اپنے منصب سے بے پرواہ اپنی مغفرت کے طلبگار اپنے مالک حقیقی سے لو لگائے اس کی طرف متوجہ ہیں۔

حج صبر و ضبط کا مزاج بناتا ہے، مختلف مزاج اور مختلف قسم کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں، جس میں امیر بھی ہیں غریب بھی، کمزور بھی ہیں طاقتور بھی، بوڑھے بھی ہیں جوان بھی، سب کے ساتھ رہنا ہے اس کو برداشت کرنا ہے، کبھی کسی سے کسی بات پر ناراضگی ہو، کسی سے تلخی ہو، کسی سے لڑائی جھگڑا بھی ہو جائے تو حکم کیا ہے: ﴿اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (البقرۃ/۱۹۷) حج کے چند مہینے متعین ہیں چنانچہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ کر) اپنے اوپر حج لازم کرلے تو حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے نہ کوئی گناہ نہ کوئی جھگڑا۔

حج ایک عالمی اجتماع گاہ ہے جہاں بغیر کسی تفریق کے لوگ جمع ہوتے ہیں ایک اللہ کی بندگی کے لیے، ایک نبی کی اقتداء میں، جن کا قبلہ ایک، جن کا مقصد ایک، اور جن کا تلبیہ بھی ایک، ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاجی اپنے حج کو پورا کرتا ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح کا غلط کام نہ ہو، وہ بڑی محنت و مشقت کے ساتھ سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے یہاں تک پہنچا ہے، اپنے نفس کو کچلتا ہے، اپنی خواہشات کو دباتا ہے، اپنی امنگوں کو مارتا ہے، اس کے مطمح نظر صرف اور صرف رضائے الٰہی ہے، وہ ہر وہ کام کرنا چاہتا ہے جس سے اس کا پروردگار خوش ہو، کبھی صفاء کا چکر لگاتا ہے کبھی مروہ کی طرف دوڑتا ہے، لوگوں کے ازدحام سے اپنے کو بچاتے ہوئے کعبہ کے اردگرد گھومتا ہے، کبھی مکہ سے منیٰ جاتا ہے، کبھی عرفات جاتا ہے، پھر منیٰ واپس آتا ہے، وہ اس طرح عمل کرتا ہے جیسے عاشقی میں مست ہو، حکم ملا عمل کیا، وہ عرفات میں گڑگڑاتا ہے بلکتا ہے، روتا ہے اپنے پروردگار کو منانے کی کوشش کرتا ہے، وہ بندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

حج میں انسان اپنے آپ کو بالکل مٹا دیتا ہے، وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی مغفرت ہو جائے، اس کی آخرت سنور جائے، گناہوں سے وہ پاک ہو جائے، اس کو اللہ کا قرب حاصل ہو جائے، عاشقی و مستی میں گاتا ہے: "لبیك اللهم لبیك، لبیك لا شریك لك لبیك، ان الحمد و النعمة لك و الملك، لا شریك لك" وہ مستانہ وار دوڑتا ہے کبھی کعبہ کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے: "اللهم زد هذا البیت تعظیما و تشریفا و مهابة و برا" کبھی روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، اللہ سے معافی مانگتا ہے، نگاہوں میں اس کے اپنے گناہ ہیں، کسی کا دل دکھایا، کسی کے ساتھ زیادتی کی، سب نظروں کے سامنے ہے، بس امید میں ہے کہ اس کا مالک اپنے گھر بلا کر اس کو ضائع نہیں کرے گا، یقین کی اس کیفیت کے ساتھ وہ حج کرتا ہے اور "من حج لله فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدته أمه" واپس ہوتا ہے۔

تزکیہ واحسان

محمد ارمغان بدایونی ندوی

اسلامی شریعت کے احکامات ومطالبات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ظاہری احکام: یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائی وغیرہ، ان احکام پر ہر کلمہ گو کو عمل کرنا فرض ہے، ان کا علم ''فقہ ظاہر'' یا ''علم شریعت'' کہلاتا ہے اور ان کی تفصیلات وجزئیات حدیث وفقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

(۲) باطنی احکام: یعنی اخلاص، صبر، توکل خشوع وخضوع اور اخلاق حمیدہ وغیرہ، اصطلاحی طور پر اسے ''فقہ باطن'' یا ''علم الاحسان'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مذکورہ دونوں قسموں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو طرح کے شرعی احکام کا مکلّف کیا ہے، ایک ظاہری احکام ہیں اور دوسرے وہ احکام ہیں جن سے اصلاح نفس وابستہ ہے، ان میں سے پہلی قسم کو ''علم شریعت'' اور دوسری قسم کو ''علم الاحسان'' کہا جاتا ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ: ۱/۵۶۰)

امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ ظاہری احکامات کا نفع فقہ باطن کے بغیر بے سود ہے۔ (التحفۃ العراقیۃ: ۳۰۸)

فقہ باطن کو قرآنی اصطلاح میں ''تزکیہ'' کہتے ہیں، جس کے لغوی معنی پاک صاف کرنا یا کسی چیز کی نشوونما کے ہیں، اصطلاح میں تزکیہ کا مفہوم نفس کا گندگیوں سے پاک ہونا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ تزکیہ کی اصطلاحی تعریف میں یوں رقم طراز ہیں کہ اخلاق رذیلہ اور نفوس کی گندگی اور جاہلی اعمال سے تطہیر نیز اندھیروں سے روشنی کی طرف لانے کا نام تزکیہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۴۴)

تزکیہ اسلامی تعلیمات کی غرض وغایت اور نبوت کے فرائض چہارگانہ کا ایک اہم ترین حصہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (الجمعۃ: ۲) (وہی ذات ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)

تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس اخلاق عالیہ سے آراستہ ہوں، رذائل سے پاک ہوں، گناہوں سے متنفر ہوں، شر کے فطری غلبہ سے دور ہوں، شیطانی حملوں سے محفوظ ہوں اور قلوب اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے معمور ہوں۔

تزکیہ کا دوسرا قرآنی نام ''احسان'' ہے، جس کے لغوی معنی عمدہ اور خوبصورت ہونے کے ہیں، شرعی اصطلاح میں احسان سے مراد یقین واستحضار کی کیفیت کا حصول اور بندگی کے مراحل کی تکمیل ہے۔

امام ابن قیمؒ احسان کی تعریف میں بیان کرتے ہیں کہ احسان کمال ایمان کی دلیل، دین کا لب لباب اور اس کی روح ہے۔

(مدارج السالکین: ۲/۴۵۹)

احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے اسلام اور ایمان کی تشریح کے ساتھ ''احسان'' کا ذکر بھی بطور خاص کیا ہے، احسان سے مراد ہر وہ عمل ہے جس کا ظاہر وباطن حسن وجمال کی منھ بولتی تصویر ہو اور وہ عقل وقلب کے لیے یکساں طور پر توجہ اور پسندیدگی کا باعث ہو۔

عمل کی اسی کشش اور جاذبیت کی انہی باطنی کیفیات کو شرعی اصطلاح میں تزکیہ واحسان یا فقہ باطن سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی بے شمار جزئیات اور آداب واحکام ہیں اور ان کی شرح وتفسیر کتاب وسنت میں موجود ہے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور مشائخ عظام کی زندگیاں اس کی بہترین آئینہ دار ہیں۔

تزکیہ واحسان ہی کی ایک متوازی اصطلاح ''تصوف'' بھی رائج ہے جس کے لغوی معنی اون کا لباس زیب تن کرنا ہے، چونکہ اہل تصوف زہد وتواضع سے قریب تر ہونے کے سبب موٹا جھوٹا اور معمولی درجہ کا لباس استعمال کیا کرتے تھے، اس لیے یہ لفظ ان کے ساتھ

مستعمل ہوگیا۔ شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ تصوف کی اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تصوف سے مراد اصلاح نفس، تصفیہ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن ہے۔ (شرح الرسالۃ القشیریۃ:۶۹)

تصوف کا موضوع بھی وہی ہے جو تزکیہ واحسان کا ہے۔ تصوف ایک عالمگیر صداقت اور انسان کی ابدی سعادتوں کی شاہ کلید ہے، جس کے ذریعہ انسان بندگی کی حقیقی حلاوت سے آشنا ہوتا ہے اور روحانی لذت وانبساط کی کیفیات سے سرشار بھی! تصوف ایک لازوال دولت اور قیمتی سرمایہ ہے، جو شریعت کے بالکل منافی نہیں، تصوف کی اصطلاح اگرچہ دوسری صدی ہجری میں رائج ہوئی مگر محض ایک نئی اصطلاح ہونے کی بنیاد پر کسی ایسی چیز سے گریز عقل کے بالکل منافی ہے جو شریعت کے مسلمات میں سے ہو، کتاب وسنت کی روشنی میں ہو اور انسانی سماج بھی اس کا انتہائی ضرورت مند ہو۔

حیرت کی بات ہے کہ دین کا ایک اہم شعبہ محض اصطلاح کی تبدیلی سے بہت سے لوگوں کے لیے قابل وحشت ہوگیا، تصوف کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ کفر وشرک، بدعات وخرافات، عملی زندگی سے راہ فرار اور شکست خوردگی کا داعی ہے، حالانکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عالمی منظرنامے پر جتنے بھی مجددانہ کارنامے ہمیں نظر آتے ہیں، ان کے پیچھے اصلاح باطن اور روحانی ترقی ہی کا راز مضمر ہے، جس نے تجدید وانقلاب کی ایک تاریخ رقم کی، سرفروشی وجانبازی کی نظیر پیش کی اور لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا۔

تاریخ اسلام کے نشیب وفراز کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اہل تصوف نے روح اسلام کی بقا کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں، دعوت وجہاد کا علم بلند رکھا ہے، مادیت کی مسموم لہروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور معاشرہ کا سر رشتہ ہمیشہ اخلاق سے جوڑے رکھا ہے، ان کی ناقابل فراموش جدوجہد نے لوگوں میں اخلاص واحتساب کا جذبہ باقی رکھا اور باطنی امراض سے حفاظت کی، واقعہ یہ ہے کہ ان کی عملی تگ ودو اور دینی جذبہ نے اسلام کے اس اہم شعبہ (تزکیہ نفس) کو فعال رکھا اور جمود وتعطل سے بچالیا۔

افسوس کا مقام ہے کہ محض اصطلاح کے پیچ وخم میں پھنس کر تصوف کے مذکورہ حقائق پر دبیز پردے ڈال دیے گئے اور غیر اسلامی اعمال اور رہبانیت کے مظاہر کو اسلامی تصوف تصور کرلیا گیا، جس میں انسان کے قوائے عملی مردہ ہوجاتے ہیں اور زندگی کے حقائق سے کوئی واسطہ نہیں رہتا، بلکہ وہ تصوف مشرکانہ عقائد کی اشاعت کا ذریعہ بن جاتا ہے، درحقیقت اس غیر اسلامی تصوف کے حاملین ایسے حقیقت فروش اور نام نہاد صوفی ہیں جنہوں نے تصوف کو اپنے گمراہ کن خیالات کی تبلیغ واشاعت کا آلہ کار بنایا اور تزکیہ نفس کے بجائے تصوف کو رہبانیت کی شکل دے دی، جس کی طرف ایک صاحب ضمیر اور غیرت مند مؤمن شخص کی طبیعت کبھی مائل نہیں ہوسکتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کی دونوں قسموں میں تفریق کیے بغیر ہی ایک بڑی تعداد مطلق تصوف سے بدظن ہوگئی اور ایک عظیم حقیقت سے ناآشنا!

متمدن دنیا میں تصوف کی غلط تفہیم وتشریح سے ایک بڑا روحانی واخلاقی خلا پیدا ہوا ہے، جس کا کوئی حل سائنس وٹکنالوجی یا ضخیم کتابوں اور نبض شناس مصنفین ومحققین کے پاس بھی موجود نہیں، بلکہ انفرادی واجتماعی مفاسد کی اصلاح میں آج بھی تصوف کا وہی قائدانہ کردار مطلوب ہے جو باطنی امراض کے لیے تریاق ثابت ہو، مغرب کی فکری یلغار ہو، عوام وخواص میں مادیت کی بڑھتی ہوئی محبت اور دنیاوی طاقتوں سے مرعوبیت، غرض کہ تصوف ان سب سے نبرد آزمائی کا کامیاب اور ایک مؤثر ذریعہ ہے جو ظاہر پرستی، دنیا داری اور ناؤنوش بعیش کوش کو مقصود زندگی سمجھنے کے مخالف ہے۔

تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک سے تغافل انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے انتہائی مضر ہے، ضرورت ہے کہ کتاب وسنت اور حضرات صحابہؓ واسلاف کی سیرت کی روشنی میں دین کے اس اہم ستون کی طرف توجہ کی جائے اور خواہشات وتعصبات سے اوپر اٹھ کر تصوف کی عالمگیر حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے، تاہم ان تمام برائیوں اور خرافات کا ازالہ بھی نہایت ضروری ہے جن کی وجہ سے اسلامی تصوف کی شبیہ داغ دار ہوتی ہے۔

United Nations

اقوام متحدہ - قیام کا پس منظر

محمد مکی حسنی ندوی

پہلی عالمی جنگ انسانی تاریخ کی وہ جنگ ہے جس نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اس جنگ میں مرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ اور پھر جنگ کے بعد پیدا ہوئی بدحالی، معاشی تباہی اور خاص کر وبائی امراض جیسے ''لنگڑا بخار'' (Spanish Flu) کی وجہ سے ہلاکتوں کی تعداد ایک کروڑ سے بھی متجاوز ہوئی۔ پانچ سے سات برس کے اس دورانیہ میں تقریباً ایک چوتھائی دنیا ختم ہوگئی، بستی کی بستی ویران ہوگئی اور شہر کے شہر اجڑ گئے۔

جنگ عظیم کی عالمی تباہی وانسانی بحران نے دنیا کے بااقتدار افراد کو ایک ایسے ادارہ کے قیام پر مجبور کردیا جو مستقبل میں ایسی جنگوں کو روک سکے اور قیام امن کے لیے کوشاں رہے، چنانچہ 1920ء میں امریکہ (جو عالمی جنگ میں اتحادی طاقت کی حیثیت سے آخر میں شامل ہوا تھا) کے مشوروں اور یورپ کے مختلف ممالک مثلاً انگلستان، جرمنی، ڈنمارک، ناروے، سویڈن وغیرہ کی کوششوں سے ایک عالمی ادارہ کا قیام عمل میں آیا جسے ''جمیعت اقوام'' (League of Nations) کا نام دیا گیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ 1931ء میں ''جمیعت اقوام'' اپنی کوششوں کے باوجود چین پر جاپان کے حملے کو روکنے میں ناکام ثابت ہوا، پھر یکے بعد دیگرے جرمنی، اٹلی اور جاپان نے جمیعت کا ساتھ چھوڑ دیا اور پھر دوسری عالمی جنگ نے ''جمیعت اقوام'' کی ناکامی (Failure) پر مہر ثبت کردی۔

دوسری جنگ عظیم کے دو برس گزرنے کے بعد عالمی سطح پر امن کوششیں پھر شروع ہوئیں، ملکوں کے درمیان معاہدے ہونے لگے، چنانچہ 12/جون 1941ء کو پہلا معاہدہ عمل میں آیا، یہ معاہدہ ''سینٹ جیمس پیلیس معاہدہ'' (Declaration of St. James Palace) کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں کچھ یورپی ممالک نے برطانیہ کی رہنمائی میں دستخط کیے، اس کے مطابق تیرہ (13) ممالک دو مخالف اتحادی حکومت یعنی جرمنی اور اٹلی کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھیں گے اور جنگ بندی کے بعد امن اور انصاف کو قائم کریں گے۔

پھر جولائی 1941ء کو ایک اور معاہدہ ''اینگلو-سوویت معاہدہ'' (Anglo-Soviet Agreement) کے نام سے ہوا، یہ معاہدہ برطانیہ اور روس کا جرمنی کے خلاف اتحاد کا معاہدہ تھا۔

اس کے بعد 14/اگست 1941ء کو امریکی صدر اور برطانوی وزیر اعظم نے ایک خفیہ ملاقات کی، دونوں ملکوں کا مقصد ایک دوسرے کو عالمی منظر نامہ کی تشکیل پر لانے کا تھا، ان دونوں ملکوں کے سربراہان نے جنگ کے بعد عالمی منظر نامے پر اپنے نظریات واضح کیے اور اسے ایک بیان کی شکل میں جاری کیا گیا، بعد ازیں ''اٹلانٹک چارٹر'' (Atlantic Charter) کے نام سے ایک معاہدہ بن گیا، یہ معاہدہ آج بھی مزید اضافوں کے ساتھ موجود ہے جس پر امریکی صدر جو بائیڈن اور برطانوی وزیر اعظم بورس جونسن نے دستخط کیے، اس معاہدے کے آٹھ بنیادی نکات ہیں:

(۱) امریکہ اور برطانیہ کسی بھی ملک سے سرحدی فائدہ نہیں اٹھائیں گے (۲) ملک کے باشندوں کی رائے پر ملک کی سرحدیں متعین ہوں گی (۳) سب کو رائے دہی کا حق ہوگا (۴) تجارتی بندشیں ہٹائی جائیں گی، (۵) عالمی معاشی ہم آہنگی اور معاشرے کی ترقی میں سدھار لایا جائے گا (۶) اس کے نمائندے خوف اور طمع سے آزاد دنیا کے لیے کوشاں رہیں گے (۷) سمندروں کو ہر قبضے سے آزاد کرانے کی کوشش کی جائے گی (۸) عمومی طور پر ہر ملک کی اور خاص طور سے جارح ملکوں کی ہتھیار بندی کی جائے گی۔

''اٹلانٹک چارٹر'' معاہدے سے دنیا کے اکثر ممالک متاثر ہوئے اور یہ اقوام متحدہ کا دستور العمل (UN Charter) بننے میں سنگ میل ثابت ہوا۔

دوسری عالمی جنگ میں امریکہ اس وقت تک شریک نہیں تھا

جب تک جاپان نے امریکہ کے مرکزی بحری بیڑہ ''پرل ہاربر'' پر حملہ نہ کردیا، یہ واقعہ دسمبر 1941ء کا ہے، یہ حملہ بہت شدید تھا اور اسی کے جوابی کارروائی میں امریکہ نے جاپان کے دو مختلف شہروں (ناگاساکی اور ہیروشیما) پر ''ایٹم بم'' گرائے۔

29/دسمبر 1941ء کو وائٹ ہاؤس میں امریکی صدر فرانکلن روزویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے پہلی جنگ عظیم کے اتحادیوں کا ''اتحاد'' قائم کرنے کی غرض سے غیر اعلانیہ ملاقات کی۔ امریکی صدر روزویلٹ نے "United Nations" یعنی ''اقوام متحدہ'' نام کی تجویز پیش کی جس کو برطانوی وزیر اعظم نے منظور کرلیا۔ 1942ء کو نئے سال کے موقع پر دنیا کے ''چار عظیم'' ملک یعنی امریکہ، برطانیہ، روس اور چین نے ایک مختصر دستاویز پر دستخط کیے پھر اس کے دوسرے دن مزید بائیس (22) ملکوں نے اس پر دستخط کیے اور پھر اسی وقت ''اقوام متحدہ'' کا اعلان کردیا۔

''اقوام متحدہ'' کے عملی قیام کی غرض سے 25/اپریل 1945ء کو سان فرانسسکو (امریکہ) میں پچاس عالمی حکومتوں نے کانفرنس میں شرکت کی اور اصول وضوابط وضع کیے، جس کو اسی سال 25/جون کو منظوری ملی اور 24/اکتوبر کو عمل میں لایا گیا۔

اقوام متحدہ کا عالمی صدر مرکز شہر نیویارک میں ہے اور دیگر چار عالمی مراکز ہیں جو جنیوا (سویٹزرلینڈ)، نائروبی (کینیا)، ویینا (آسٹریا) اور ہاگ (ہالینڈ) میں قائم ہیں۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کا مرکز ہر اس ملک میں بھی ہے جو اس کا ممبر ہے۔

اقوام متحدہ کی ابتداء 51/ممبران سے ہوئی تھی، لیکن 2011ء میں جنوبی سوڈان کی شمولیت کے بعد 193/ممبران ہو گئے جبکہ فلسطین کو شامل نہیں کیا گیا، اس کے علاوہ ویٹکن سٹی اور مقدس کرسی (Holy See) (مستقل کلیسائی حکومت) نے ابھی تک اس کے ممبر شپ کو قبول ہی نہیں کیا۔ ان کے علاوہ چھ ایسے ممالک بھی ہیں جن کو اقوام متحدہ بحیثیت ملک تسلیم نہیں کرتا: (۱) کوسوو (۲) مغربی سہارا (۳) تیوان (۴) مغربی اوسیٹیا (۵) ابخازیا (۶) شمالی سائپرس۔

ادارہ اقوام متحدہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جس کے قیام کا مقصد عالمی امن وتحفظ، بین الاقوامی دوستانہ تعلقات کو ترقی دینا، عالمی امداد کا حصول اور حکومتوں کے عمل درآمد کو آپس میں ہم آہنگ بنانا ہے۔

دنیا کے تمام ممالک کی کوشش اور شراکت سے اقوام متحدہ کو اعتماد، جرات اور منصف کا مقام حاصل ہے، مگر کچھ ایسے مقامات بھی آئے جہاں اقوام متحدہ ناکام ثابت ہوا، اور کئی ممالک نے علاحدگی کا عندیہ بھی ظاہر کیا، انڈونیشیا، فلپائن اور خود امریکہ نے سرکاری بیانات بھی جاری کردئے، اگرچہ اس پر باقاعدہ عمل انڈونیشیا کی جانب سے ہوا، لیکن اس نے بھی ایک ہی سال کے بعد دوبارہ شمولیت کا اعلان کردیا۔

موجودہ وقت میں اقوام متحدہ کے تقریباً ایک لاکھ ارکان دنیا کے ایک سو بیس ممالک میں قیام امن کے لیے سرگرم ہیں، اس کی مختلف ایجنسیاں حفظان صحت کے لیے کوشاں ہیں، اور ایڈس، ایبولا، کولرا، انفلوئنزا، پیلا بخار، مینجائیٹس اور کرونا جیسی بیماریوں سے مستقل لڑ رہی ہیں، چیچک اور پولیو کو دنیا سے ختم کرنے تقریباً کامیاب بھی ہوچکی ہیں، ان عالمی کوششوں کی بنیاد پر مختلف افراد اور متعدد ایجنسیوں کو نوبل انعام سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

بدقسمتی سے اقوام متحدہ بہت سے محاذ پر بری طرح ناکام بھی ہوا ہے اور اس پر متعدد الزامات عائد کیے گئے، مثلاً 1994ء میں افریقہ کے روانڈا ملک میں دسیوں لاکھ لوگوں کے قتل عام کو روکنے میں ناکامی کا الزام۔ فلسطین اور اسرائیل کے مسئلہ میں جانبداری کا الزام۔ 2010ء کے زلزلہ کے بعد اقوام متحدہ کے طبی کارندوں پر ہائیتی ملک میں کولرا پھیلانے کا الزام۔ امن کے کارندوں پر کونگو، کمبوڈیا اور ہائیتی جیسے مختلف غریب ممالک میں جنسی استحصال اور بدکاری کا الزام۔ عراق میں تیل کے بدلے کھانا کا نظام پر دھوکہ دہی کا الزام۔ فلسطین، عراق، بوسنیا، سیریا، برما کے روہنگیا مسلمان، کشمیر، چین کے اُوگر مسلمان اور دنیا کے مختلف ممالک میں لاکھوں کی تعداد میں قتل عام کو روک نہ سکنے کا الزام، اس طرح کے مختلف الزامات ہیں جن سے اقوام متحدہ کا کردار مشکوک اور غیر مؤثر قرار پاتا ہے۔ (جاری)

مسلم حکمرانوں کے مظالم

مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب

محمد نفیس خاں ندوی

جب کوئی عام انسان عیش وعشرت کا دلدادہ ہوتا ہے تو وہ خود یا زیادہ سے زیادہ اس کا گھر تباہ ہوتا ہے،لیکن جب ارباب اقتدار طاؤس ورباب میں گرفتار ہوجائیں تو ملک تباہ ہوجاتا ہے،حکومت کی چولیں ہلنے لگتی ہیں اور پھر اپنے وجود کے بقا کے لیے وہ ظلم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

جب حکومتوں پر اخلاقی زوال آتا ہے تو سب سے پہلے وہاں سے عدل وانصاف رخصت ہوتا ہے،حکومت کی مخدوش عمارت کو ظلم کے ذریعہ کچھ سنبھالا تو مل سکتا ہے لیکن اس کی بنیادوں سے دیمک کو دور نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے جس اخلاقی بلندی،عدل وانصاف اور پاکیزہ کردار کے ساتھ حکومت بنی امیہ کی بنیاد رکھی تھی ان کے جانشینوں نے اس کی ذرہ برابر رعایت نہ کی،حکومت کے غرہ میں اخلاقی حدیں پار کردیں،عیش وعشرت،شراب وکباب اور لہوولعب کے بعد ظلم وستم کی وہ داستانیں رقم کیں کہ انسانیت بھی شرم سار ہوجائے۔

حضرت حسینؓ کے ساتھ میدان کربلا میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ اسلام کی ایک خونچکاں داستان ہے،بچہ بچہ اس سے واقف اور ہر صاحب ایمان کے دل میں اس کی کسک موجود ہے۔اسی دور میں واقعہ حرہ بھی پیش آیا،جب مدینہ منورہ کی عظمت اور اس کے تقدس کا پامال کیا گیا،اہل ایمان کی عزتیں نیلام کی گئیں،کشت وخون کا بازار گرم کیا گیا،فوج کو تین دن کے لیے سبھی اخلاقی حدوں سے آزاد کردیا گیا۔

ایسا ہی دردناک واقعہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں بھی ہوا،حجاج کے لوگوں نے ان کو بے دردی سے ذبح کردیا، پھر حجاج نے ان کا سر جسم سے الگ کرکے مدینہ بھیج دیا جہاں اسے نمائش کے لیے رکھ دیا گیا۔

بنوامیہ کے مقابلہ نئے مدعیان خلافت یعنی بنوعباس اس وجہ سے کامیاب ہوئے تھے کہ انھوں نے یقین دلایا تھا کہ ہم خاندان رسالت کے لوگ ہیں،ہم کتاب وسنت کے مطابق کام کریں گے، ہم حدوداللہ کے قیام کے لیے میدان میں آئے ہیں،لیکن حکومت ملنے کے کچھ مدت بعد ہی انھوں نے ثابت کردیا کہ یہ سب فریب تھا،بنوامیہ کے دارالسلطنت دمشق کو فتح کرکے عباسی فوجوں نے جو قتل عام کیا اس میں تقریباً پچاس ہزار مسلمان قتل کیے گئے،ستر دن تک جامع بنی امیہ گھوڑوں کا اصطبل بنی رہی،حضرت امیر معاویہؓ سمیت تمام بنی امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں،ہشام بن ملک کی لاش قبر سے صحیح سلامت نکلی تو اسے کوڑوں سے پیٹا گیا،چند روز تک اسے منظر عام پر لٹکائے رکھا گیا اور پھر جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑادی گئی،بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا،پھر ان کی لاشیں ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچی گئیں اور سڑکوں پر ڈال دی گئیں۔

بنوعباس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس سفاح کے خلاف موصل میں بغاوت ہوئی تو اس نے اپنے بھائی یحیٰ کو سرکوبی کے لیے بھیجا،یحیٰ نے اعلان کیا کہ جو شہر کی مسجد میں داخل ہوجائے گا اس کے لیے امان ہے،لوگ ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع ہوگئے،پھر دروازہ پر پہرا بٹھا کر ان امان یافتہ پناہ گزینوں کا قتل عام کیا گیا،کئی دن تک موصل میں قتل وغارت کا بازار گرم رہا،یحیٰ کی فوج میں چار ہزار زنگی تھے،وہ

موصل کی عورتوں پر ٹوٹ پڑے اور زنا بالجبر کا طوفان برپا کر دیا۔

''ایک عورت نے یحییٰ کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر شرم دلائی کہ تم بنو ہاشم سے ہو اور رسول اللہ (ﷺ) کی چچا کی اولاد ہو، تمھیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے زنگی فوجی عرب عورتوں کی آبروریزی کرتے پھر رہے ہیں۔''

عباسی خلفاء میں ایسے بہت کم تھے جو اعلیٰ ذاتی اوصاف کے مالک کہے جاسکیں، خلیفہ منصور کو سادگی پسند اور عدل پرور سمجھا جاتا ہے جب کہ اسی نے امام اعظم ابوحنیفہ کو درّے لگوائے اور قید میں ڈال کر سخت اذیتیں دیں حتی کہ ان کا انتقال ہوگیا، ان کے علاوہ قطب وقت حضرت سفیان ثوریؒ اور عباد بن کثیر بھی اس کے ستم سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ ابومسلم خراسانی نے بنوعباس کو اقتدار میں لانے کی خاطر یمن، عرب، عراق اور ایران میں تقریباً چھ لاکھ افراد کا خون بہایا تھا، لیکن منصور کے نزدیک عباسی حکومت کے لیے سب بڑا خطرہ وہی تھا، چنانچہ دغا وفریب کے ذریعہ اس نے ابومسلم کو دربار میں بلایا اور پردہ کے پیچھے چھپے اپنے سپاہیوں کے ذریعہ دھوکہ سے اسے قتل کرادیا۔

خلافت عثمانیہ کی مضبوط بنیادوں کو بھی حکمرانوں کی اخلاقی پستی اور ان کے ظالمانہ مزاج نے ہی خستہ کر دیا تھا، جب حکمرانوں کی تربیت کا نظام بگڑنے لگا، حکام وسپہ سالار قوم وسلطنت سے غداری کرنے لگے، بادشاہ مستبد اور جابر ہونے لگے تو خدائی فیصلہ بھی نافذ ہوا اور طمطراق سے حکومت کرنے والی عثمانی خلافت ایک مرد بیمار بن گئی جس نے بالآخر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان دے دی۔

عثمانی حکمراں میں سلطان مراد ثالث ایک عظیم فرمانروا کی حیثیت سے معروف ہے، والد کی وفات کے ساتھ ہی اس نے زمام حکومت سنبھال لی اور باپ کی تجہیز وتکفین سے قبل ہی اپنے پانچ سگے بھائیوں کی موت کا فرمان جاری کر دیا اور پھر ان سب کی تجہیز وتکفین کی رسمیں ایک ساتھ ادا کی گئیں۔

مؤرخ کے بقول: سلطنت عثمانی کے دستور کے مطابق اس نے اپنے پانچوں بھائیوں کے قتل کا حکم صادر کیا، چنانچہ ایک ہی وقت میں ان کا گلا گھونٹ دیا گیا، پھر اس نے حکم دیا کہ اس کے والد کے ساتھ ہی ان کی بھی تجہیز وتکفین کی جائے۔

عثمانیوں میں بعض پاشے نہایت قبیح افعال کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے کمزور عوام پر بے انتہا ظلم ڈھائے، ابراہیم پاشا جو سلطان مراد ثالث کا وزیر تھا اور اس کی بہن سلطان کے یہاں خاص مقام رکھتی تھی، دیار بکر کا پورا علاقہ اس کی تولیت میں تھا، وہ امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا، اس نے اس علاقہ میں بے پناہ ظلم ڈھائے، لوگوں کے ساتھ ایسی ایسی زیادتی اور خباثتیں کیں کہ ان کا لکھنا بھی محال ہے، عورتوں کی آبرو سے کھیلنا، ان کی جمع پونجی پر ہاتھ صاف کرنا، جو جی میں آتا کر گذرتا، جب اس کی شکایت سلطان تک پہنچی اور اس کو عدالت میں حاضر کیا گیا تو سلطان نے شکایت پہنچانے والوں کو بھی حاضر ہونے کا حکم دیا، لوگ اتنے سہمے تھے کہ اس کے خلاف گواہی دینے کی کسی میں جرات نہ ہوسکی اور نہ قاضی میں اتنی ہمت تھی کہ وہ جرح کر سکے بالآخر وہ دوبارہ دیار بکر کا والی مقرر ہوا اور شکایت کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی، وہ مظلوم ایک قلعہ میں بند ہوگئے تو ابراہیم پاشا کے حکم سے ان شہریوں پر توپوں کے گولے داغے گئے اور ایک خلق کثیر کو قتل کر دیا گیا۔

محمد علی پاشا نے مصر، شام اور حجاز کے رہنے والوں پر اور ترکوں نے عربوں، کُردوں اور البانیہ کے لوگوں پر جو مظالم ڈھائے وہ تاریخ کا ایک خونیں تذکرہ ہے۔

مسلم حکمرانوں کے اس خطرناک انحراف، عیش وعشرت، لہو ولعب اور پھر ظلم وستم کے مزاج کا طبعی نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت کی بقا کے ستون پیوند خاک ہونے لگے اور سلطنتیں یکے بعد دیگرے فنا کے گھاٹ اترنے لگیں۔ کارکنان مملکت اور ارباب اقتدار کو تاریخ کی اس گونجتی صدا پر کان دھرنا چاہیے کہ ان کے ظالمانہ مزاج نے مملکتوں کو تباہ کر دیا اور نسل کی نسل کو غلامی کی بیڑیوں میں جکڑ دیا۔

ایام تشریق اورتکبیرات تشریق

نویں ذی الحجہ کی فجر کی نماز کے بعد سے تیرھویں ذی الحجہ کی عصر کی نماز کے بعد تک، ہر فرض نماز کے بعد بلند آواز سے مردوں پر اور آہستہ آواز سے عورتوں پر پڑھنا یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا إِلٰہَ إِلَّااللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ

اور اگر فرض نماز کے بعد امام تکبیر پڑھنا بھول جائے تو مقتدیوں کو چاہیے کہ وہ بلند آواز سے تکبیر پڑھیں۔ یہ تکبیرات ایک مرتبہ پڑھنا واجب اور تین مرتبہ پڑھنا سنت ہے۔

عید الاضحی کے دن کی سنتیں

☆ صبح کو جلدی اٹھنا ☆ مسواک کرنا ☆ غسل کرنا ☆ اچھے کپڑے پہننا ☆ خوشبو لگانا ☆ عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا ☆ عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا ☆ عیدگاہ جلدی جانا ☆ عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد قربانی کا گوشت کھانا۔ ☆ پیدل جانا ☆ ایک راستہ سے جانا دوسرے راستہ سے واپس آنا ☆ راستہ میں تکبیر تشریق (اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا إِلٰہَ إِلَّااللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ) پڑھتے ہوئے جانا۔

قربانی کا طریقہ

قربانی کا سنت طریقہ یہ ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف دی جائے، اسے زیادہ تڑپایا نہ جائے، زمین پر لٹانے میں ایسا طریقہ نہ اپنایا جائے کہ جس سے جانور گھبرا کر بدکنے لگے، جب جانور قربان گاہ میں آجائے تو اسے جلد ذبح کرنے کی کوشش کی جائے، چھری اور رسی وغیرہ پہلے سے تیار رکھی جائے، پھر جب قربانی کا جانور قبلہ رخ لٹادے تو پہلے یہ دعا پڑھے:

"إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ حَنِيفاً وَّ مَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ،
إِنَّ صَلَاتِي وَ نُسُكِي وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ
وَ بِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَ لَكَ"

پھر "بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ أَکْبَرُ" کہہ کر ذبح کرے، اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِيْبِكَ مُحَمَّدٍ ،وَ خَلِيْلِكَ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمَا الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ"۔

اگر ایک دوسرے کی طرف سے قربانی کر رہا ہو تو "مِنِّيْ" کے بجائے "مِن" کہے اور "مِنْ" کے بعد جس کی طرف سے قربانی کر رہا ہے اس کا نام لے۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 13 ✦ July 2021 ✦ Issue: 07

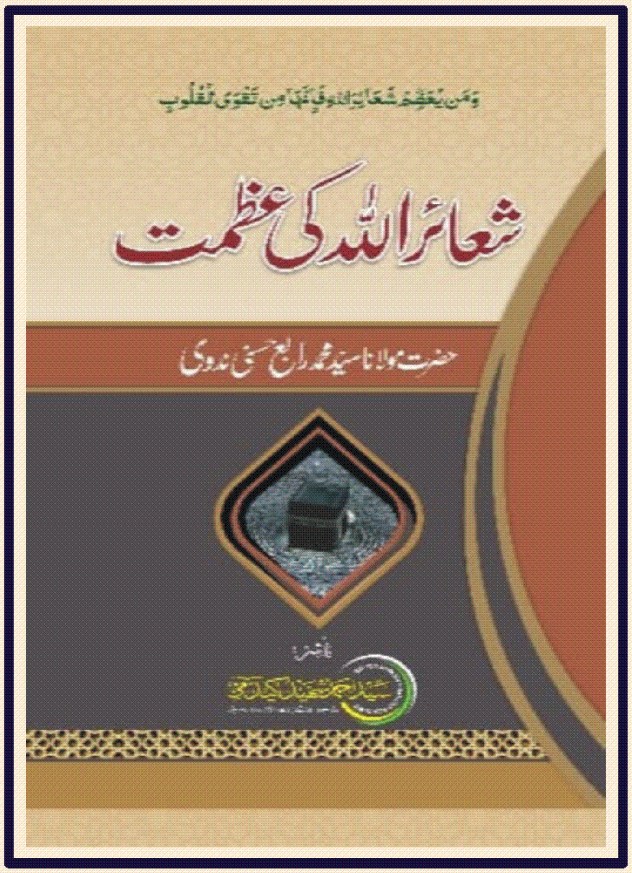

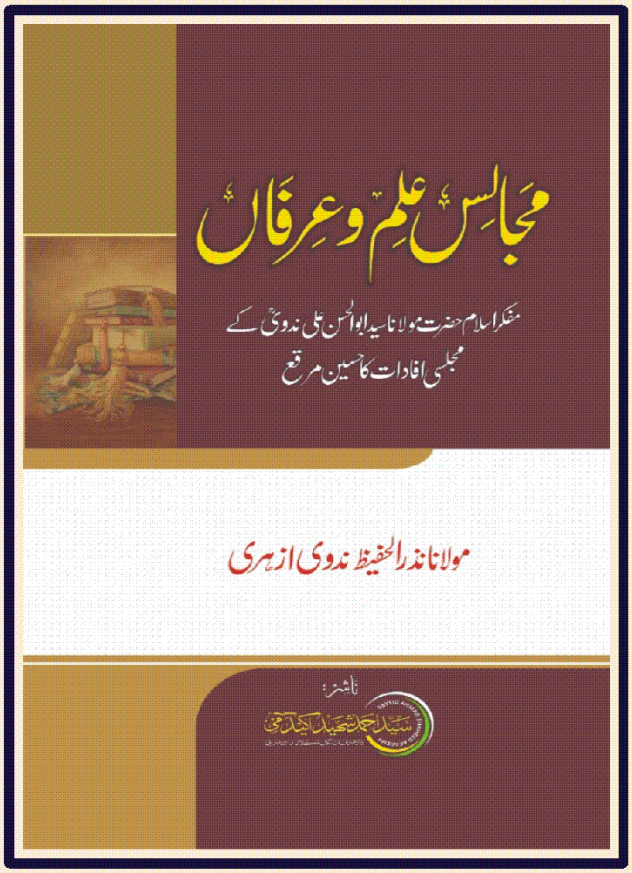

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)